اداریہ

امریکی سینیٹ کی "کمیٹی برائے امورِ خارجہ" کے سامنے بیان دیتے ہوئے محترمہ رابن رافیل (اسسٹنٹ سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے جنوبی ایشیا) نے واضح کیا ہے کہ پاکستان میں رائج قانون تحفظِ ناموسِ رسالت کی تنسیخ کے لیے امریکہ نے بار بار علانیہ مطالبہ کیا ہے۔ اسلام آباد میں مقیم امریکی سفیر اور دوسرے امریکی حکام اعلیٰ ترین سطح پر تسلسل کے ساتھ یہ مسئلہ اٹھاتے رہے ہیں اور جب وزیر اعظم بھٹو امریکہ کے دورے (اپریل ۱۹۹۵ء) پر تشریف لے گئی تھیں تو اُس وقت بھی اُن سے اس مسئلے پر گفتگو ہوئی تھی۔ محترمہ رافیل نے وزیر اعظم پاکستان کی طرف سے قانون توہینِ رسالت میں ترمیم کی خواہش اور ارادے پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں اس لیے کامیاب نہ ہو سکیں کہ حزب اختلاف اور مذہبی جماعتیں اُن کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ محترمہ رافیل نے اپنی گفتگو اس بات پر ختم کی ہے کہ جب تک پاکستان میں یہ قانون موجود ہے، امریکی حکام پاکستانی قیادت پر زور دیتے رہیں گے کہ وہ اس "امتیازی اور اشتعال انگیز" قانون کو ختم کرے۔

محترمہ رافیل نے اپنے ملک کے پالیسی سازوں کے سامنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں اولاً، اُن کی اپنی معاشرتی اور نظریاتی اقدار کو دخل حاصل ہے۔ امریکہ کے عوام کی غالب اکثریت سیکولر - لبرل اقدار پر یقین رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک مذہب خدا اور فرد کے درمیان ذاتی معاملہ ہے اور ریاست و مذہب کے دائرے الگ الگ ہیں۔ ثانیاً محترمہ رافیل نے اپنے بیان میں اُن پاکستانیوں کے نقطۂ نظر کو اہمیت دی ہے جو وطنِ عزیز کے ۹۸ فیصد مسلمانوں کو اُن کی دینی اقدار کے مطابق معاشرے کی تشکیل کا حق دینے کو تیار نہیں۔ کیا توہینِ رسالت کی سزا ۱۹۸۰ء کے عشرے میں پہلی بار تجویز کی گئی تھی؟ ہرگز نہیں، قانون توہینِ رسالت میں تجویز کردہ سزا وہی ہے جو صدیوں سے مسلمان قانون دان تجویز کرتے آئے ہیں اور جب ماضی میں دریدہ دہنوں کی سرکوبی کے لیے "قانون توہینِ رسالت" جیسا کوئی قانون نہیں تھا تو کیا اُنہیں کہیں جائے پناہ مل سکی تھی؟

امریکی حکام اس بات کے بڑے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں، کہ اسلام کا مطالعہ کیا جائے اور مسلمانوں سے بہتر تعلقات استوار کیے جائیں۔ امریکی خاتونِ اوّل نے جنوبی ایشیا کے اپنے دورے کے تاثرات میں اسی بات پر زور دیا، پھر عید الفطر کے موقع پر وہائٹ ہاؤس میں ایک استقبالیے کا انتظام کیا گیا اور صدر کلنٹن کی جانب سے مسلمانوں کے لیے پیغامِ عید نشر کیا گیا، مگر ان ساری کوششوں میں یہ احساس "غائب" ہے کہ مسلمان بحیثیتِ مجموعی سیکولر ذہن کے مالک نہیں۔ اُن سے ایک ایسے طرزِ عمل کی توقع کی جا رہی ہے جو اُن کی روایات و اقدار سے میل نہیں کھاتا، مگر اس سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مسلمان اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ وہ تو اپنی اقدار اپنے اوپر نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مسلمانوں کے اس جمہوری حق کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ اپنے دین کے مطابق معاشرہ تشکیل دینے میں آزاد ہیں۔